کشمیر: کشیدگی میں تخفیف کافی نہیں

تحریر: الیگزینڈر ایوانز

ترجمہ: سید محمد قاسم

تشدد کے تیرہ ہنگامہ پرور برسوں کے بعد آج کشمیر کی فضا میں تبدیلی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں دیرینہ حقائق پر از سرنو غور جاری ہے اور ممکن ہے کشمیر سے اس کی وابستگی اور عزم کے باوجود اس کے روائتی موقف میں تبدیلی آ جائے۔ بھارت میں جو نیا اعتماد پیدا ہو رہا ہے وہ اس عمل کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ امریکہ بھی سرد جنگ کے دور کی پالیسیوں کی جگہ علاقائی ترجیحات کی نئی پالیسیاں وضع کر رہا ہے۔

کشمیر کے حوالے سے کوئی تبدیلی یقیناً خوش آئند ثابت ہوگی۔ پاکستان کی جانب سے کشمیریوں کی خواہشات کو نظر انداز کیے بغیر بنائی گئی زیادہ حقیقت پسندانہ پالیسی اس کے مغربی دنیا سے بگڑے ہوئے تعلقات درست کرنے اور بھارت سے سنجیدہ مذاکرات کی بنیاد بن سکتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھارت ایسے کسی اقدام کا مثبت جواب دے گا۔

صدر کلنٹن کے دورہ جنوبی ایشیا ۲۰۰۰ء کے بعد اس خطے کے بارے میں اس کا لب ولہجہ یکسر بدل گیا ہے۔ وہ خطہ جسے وہ ہمیشہ نظر انداز کرتا رہا اب اسے وہاں اپنے مفادات کے تحفظ کی فکر ہے۔ کشمیر کا مسئلہ امریکی ایجنڈے پر بنیادی حقیقت کے طور پر شامل رہے گا کیونکہ تجزیہ نگار اسے ایک ایسی چنگاری قرار دیتے ہیں جو جنوبی ایشیائی تنازعات میں دھماکہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ صدر جارج بش کے لیے بھارت کے ساتھ تعلقات میں مضبوطی اور گہرائی یا تناؤ کا سوال بھی اہم ہے۔ نئی دہلی کے مطالبات پر انہیں سنجیدگی مگر احتیاط سے غور کرنا ہوگا۔ فی الوقت وہ پاکستان کے زیادہ دوست نہ بھی ہوں تو بھی علاقائی سلامتی کے

---

* Alexander Evans, "Reducing Tension is not Enough", *The Washington Quarterly*, Spring 2001, pp. 181-193.

لیے امریکی مفادات کا تحفظ ضروری ہے۔ اور شاید مستقبل میں وسط ایشیا میں توانائی کے وسائل تک رسائی کو بھی یقینی بنانا ہے۔

کشمیر نہ صرف جغرافیائی سیاست کی بنا پر توجہ چاہتا ہے، بلکہ اپنے عقیدہ، موقف یا زبان سے قطع نظر ہر کشمیری منصفانہ اور جمہوری نظام تلے جینے کا حق رکھتا ہے۔ بھارتی سفارت کار نجی طور پر بش انتظامیہ کے طرز عمل کو یک طرفہ سمجھتے اور اس سے خوف کا اظہار کرتے ہیں۔ امریکہ کے نیشنل میزائل ڈیفنس پروگرام کو نئی دہلی میں بہت سے لوگ شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک بھارتی دفاعی تجزیہ نگار نے کہا ہے کہ امریکہ کا نیشنل میزائل ڈیفنس نظام شمالی کوریا یا عراق کے خلاف نہیں بلکہ اس کا نشانہ ابھرتی ہوئی میزائل قوت بھارت ہے۔ یہ بیان بھارتی خدشات کا کمزور سا اظہار ہے لیکن یہ سرد جنگ کے دور کی یاد دلاتا ہے جب بھارت امریکی پالیسیوں پر مستقل شک وشبہ کی نگاہ رکھا کرتا تھا۔ کچھ بھی ہو جنوبی ایشیا کے حساس سیاست دانوں سے معاملات طے کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اگر بھارت کو امریکی محرکات یا مقاصد کی بو آئی تو خطہ میں امریکی مداخلت کے اثرات منفی ہو سکتے ہیں۔

ایک پر اعتماد اور قابل بھروسہ بھارت کو اچھی قیادت میسر ہو تو وہ اعتدال پسند کشمیری قیادت سے مذاکرات کے موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں فوری اور نمایاں پیش رفت کی توقع نہیں تاہم کسی قسم کی بات چیت اور رابطوں کا سلسلہ کشمیر میں جاری موجودہ آمرانہ نظام اور مستقل آہ وزاری سے بہتر ہوگا۔ بھارتی خفیہ اداروں اور مجاہدین کی قیادت کے مابین ابتدائی آنکھ مچولی اس بات کی علامت ہے کہ رابطوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں عرصہ سے جاری ویزہ کی پابندیوں میں نرمی کے نتیجے میں متعدد جلاوطن کشمیری راہنما اور کارکن اپنے گھروں کو واپس آئے۔ ان میں سے بیشتر کشمیر پر بھارتی تسلط کے بدترین مخالف ہیں۔ کچھ اپنے بچھڑے ہوئے اہل خانہ سے مل رہے ہیں بعض بھارتی حکومت اور اس کے مخالفین کے درمیان خاموش رابطوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

۲۰۰۱ء کا اہم سوال یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک اور جنگ ہوگی یا نہیں؟ امن کا مزید ایک سال گزر سکتا ہے لیکن اب بھی دونوں ممالک میں تعلقات کی بہتری کے لیے سوچ کے انداز کو درست کرنا ضروری ہے۔ ماضی میں مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لیے زبردست تجویزیں پیش کی گئیں اور ان پر

عمل درآمد کے طریقے بھی سوچے گئے۔ اس کے باوجود مسئلہ حل نہ ہونا ایک المیہ ہے۔ بہرحال مسئلہ کشمیر حل ہونا اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے اس کے حل کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ مسئلہ کشمیر سے امریکہ کا مفاد وابستہ ہونا خوش آئند بات ہے۔ نیویارک کے کشمیر سٹڈی گروپ اور اس طرح کی کئی اور تنظیموں اور افراد کے دانش مندانہ تجزیوں سے بھارت، پاکستان اور کشمیریوں کے مابین زیادہ بامقصد مذاکرات کی راہ ہموار ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

ایک گھمبیر تاریخ

اس مسئلے کی تاریخ خاصی پرانی ہے جو ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند سے بھی پہلے کی ہے۔ جنگی خدمات کے صلے میں ملی ہوئی ریاست کشمیر پر ایک مہاراجہ حکمران تھا۔ برصغیر سے برطانیہ کے انخلاء کے بعد اسے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ کرنا تھا۔ کئی ماہ کے پس وپیش کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اس نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا۔ اس وقت کے بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے وعدہ کیا کہ اس الحاق کی توثیق جموں وکشمیر کے عوام ہی کریں گے جن کی اکثریت مسلمان ہے۔ الحاق کے اعلان کے ساتھ ہی بھارت اور پاکستان کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی کشمیر پر پہلی جنگ کا باعث بنی اور دونوں ممالک ایک ایسی تاریخی مخاصمت میں گرفتار ہوگئے جس سے باہر نکلنے کا راستہ انہیں آج تک نہیں مل سکا۔

اقوام متحدہ کی ابتدائی مداخلت کے بعد کشمیر کے سلسلے میں قراردادوں کا سلسلہ چل نکلا جن میں مسئلہ کے حل کے لیے تین مرحلوں پر مشتمل لائحہ عمل تجویز کیا گیا: فوجوں کی جلد از جلد واپسی، آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے اور عبوری حکومت کا قیام۔

اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے ۱۹۵۰ء کے اوائل تک دلائل سامنے آتے رہے۔ کشمیر میں مقامی جمہوری حکومت کے قیام کے بعد استصواب رائے کا مطالبہ بے معنی ہو چکا ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں دو مزید جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ کشمیر اور دوسری وہ جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش بنا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے [دونوں ممالک میں] ایک ایسا تعطل پیدا

ہوا جس میں اس کے بعد ہونے والے معاہدۂ تاشقند نے محض اضافہ ہی کیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں شملہ معاہدہ میں طے پایا کہ بھارت اور پاکستان دوطرفہ مذاکرات [یا باہمی متفقہ ذرائع سے] مسئلہ کشمیر کے حل کی کوشش کریں گے۔ بھارتی نقطہ نظر سے اس معاہدے نے کشمیر کو دونوں ممالک کے درمیان خالصتاً دوطرفہ معاملہ بنا دیا ہے۔ پاکستان سمجھتا ہے کہ اس معاہدے سے کشمیر کی مسئلہ متنازعہ حیثیت کو مزید تقویت ملی ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں پر اس کا کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔

بھارت ۱۹۴۷ء کے الحاق کے فیصلے کو حتمی قرار دیتا ہے اور کشمیر کی مسلم اکثریتی ریاست کو اپنے سیکولرزم کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پاکستان اسے صریح ناانصافی قرار دیتے ہوئے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کے حق خودارادیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کشمیر کو ایک متنازعہ مسئلہ قرار دیتے ہوئے توقع کرتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان اس تنازعہ کو باہمی بات چیت کے ذریعے ایک روز حل کر لیں گے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جھگڑے کی بنیاد کشمیر ہے لیکن کشمیری خود کیا چاہتے ہیں یہ سوال بدستور اپنی جگہ ہے۔ کشمیر میں، جسے مہاراجہ اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا تھا، ایک مقبول عوامی تحریک نے ۱۹۳۰ء میں جمہوریت کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے ذریعے، جو ۱۹۴۰ء تک جاری رہی، شیخ محمد عبداللہ ایک مقبول عوامی راہنما کے طور پر سامنے آئے۔ شیخ عبداللہ نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کشمیر پر حکومت کی اور پھر اس شبہ پر کہ وہ کشمیر کی بھارت سے آزادی کو ترجیح دیں گے، انہیں حکومت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس دوران کئی بھارت نواز وزراء اعلیٰ کی تقرری کے بعد ۱۹۷۵ء میں پھر شیخ عبداللہ کو وزیراعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں اُن کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے فاروق عبداللہ نے اُن کی جگہ لے لی۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں بے روزگاری، سرکاری پروپیگنڈے اسلام کے لیے بڑھتے ہوئے مطالبات، اور انتخابات میں دھاندلی جیسے مختلف عنوانات کے تحت بھارتی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی۔ ۱۹۸۸ء میں یہ اضطراب محاذ آرائی میں تبدیل ہو گیا اور جموں و کشمیر کی آزادی [خودمختاری] کی حامی جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ [جے کے ایل ایف] کے نوجوانوں نے بھارتی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کا آغاز کر دیا۔ اس کے تیزی سے پھیل جانے کی ایک وجہ تو پاکستان کی اس کے لیے پوشیدہ مدد و

حمایت تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ بھارت نے غیر معمولی سختی اور مظالم کے ذریعے اسے کچلنے کی کوشش کی۔ ۱۹۸۹ء میں حزب المجاہدین بھی میدان میں اتر آئی، جو کشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پانچ ہزار کشمیری مجاہدین سے اڑھائی لاکھ بھارتی فوج برسرپیکار تھی اور ہزاروں کشمیری ہلاک ہو چکے تھے۔ عالمی سطح پر بھارت انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے سنگین الزامات کی زد میں تھا۔ جواباً نئی دہلی کی حکومت، پاکستان پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کشمیر میں دراندازی (proxy war) کا الزام لگاتی تھی۔ کشمیر میں سیاست کی زبوں حالی کی بنا پر سیاسی جماعتوں اور عسکری گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور ۱۹۹۵ء سے دو مزید بنیاد پرست عسکری گروہوں لشکر طیبہ اور حرکت الانصار نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی۔ حرکت الانصار نے اب اپنا نیا نام حرکت المجاہدین رکھ لیا ہے۔ آج یہ دونوں گروہ، حزب المجاہدین اور نسبتاً چھوٹی کئی دوسری تنظیموں کے ہمراہ کشمیر میں ایک چھوٹی مگر زیادہ خطرناک عسکری مہم چلا رہے ہیں۔ جے کے ایل ایف اگرچہ اب بھی ایک سیاسی قوت ہے لیکن ۱۹۹۴ء سے جنگ بندی پر عمل پیرا ہے۔ اس کی عسکری قوت بھی محدود ہے۔ حزب المجاہدین ایک بڑی عسکری تنظیم ہے کیونکہ کشمیر میں جماعت اسلامی اس کی پشت پر ہے۔ جماعت اس تنظیم کی تسلسل کے ساتھ حمایت اور امداد کرتی ہے۔ اس کی وسیع بنیاد موجود ہے جس سے دیگر تنظیمیں محروم ہیں۔

مئی ۱۹۹۹ء میں کارگل کی لڑائی نے نواز شریف اور واجپائی ملاقات سے پھوٹنے والی امن کی کونپل کو مسل ڈالا۔ پاکستانی دراندازوں نے، جنہیں پاکستان مجاہدین کہتا ہے اور بھارت پاکستانی فوجی قرار دیتا ہے، سری نگر۔ کرگل شاہراہ کے قریب اور کنٹرول لائن پر بھارت کی جانب فوجی اہمیت کی کئی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ کئی ہفتے کی جنگ کے بعد، امریکہ کی سفارتی کوششوں اور بھارت کی بعض جنگی کامیابیوں کے باعث پاکستانی لشکر واپس ہو گئے۔ اس سے اس خطے [کی سلامتی] کو سنگین خطرات لاحق ہو گئے اور پاکستان پر امریکی اعتماد کو بھی سخت دھچکہ لگا۔

ذرائع ابلاغ کی شہ سرخیوں میں مستقل طور پر رہنے والا مسئلہ کشمیر بھارت کے لیے ایک مہنگا دردِ سر بنا ہوا ہے۔ [لیکن اس کے باوجود] کشمیر پر سخت بھارتی موقف اپنی جگہ اسی طرح برقرار ہے۔ اگرچہ پرتشدد کارروائیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن لڑنے والے زیادہ تر کشمیر کے باہر سے آ رہے ہیں۔ اس

دوران دہشت گردی کے بعض ایسے بڑے واقعات ہوئے ہیں مثلاً ۱۹۹۵ء میں پانچ مغربی سیاحوں کا قتل اور دسمبر ۱۹۹۹ء میں ایک بھارتی طیارے کا اغوا، جس سے بھارت کے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ کشمیر میں جنگ کسی مقبول عوامی تحریک کا نتیجہ نہیں بلکہ بیرونی مداخلت کاروں کی کارروائیاں (proxy war) ہیں۔ بعض افراد اقلیتی ہندوؤں کے قتل کے بعض واقعات کی بنا پر اس تحریک کو بنیاد پرست تحریک قرار دیتے ہیں لیکن یہ دعویٰ مکمل طور پر درست نہیں۔

فضا میں تبدیلی

جولائی ۲۰۰۰ء میں حزب المجاہدین نے اچانک جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ چند ہی دنوں میں حزب المجاہدین کے کارکن بھارتی فوجیوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے (اور جیت رہے تھے)۔ اور ان میں زیر زمین چلے جانے کی کوئی خواہش نظر نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ دیگر عسکریت پسند گروہ کارروائیاں جاری رکھنے پر مُصر تھے۔ جنگ بندی کے اعلان کے بعد ۲۴ گھنٹوں کے اندر متعدد حملوں کے نتیجے میں ۹۰ افراد ہلاک ہوئے۔ اس وقت صورت حال پیچیدہ ہوگئی جب کشمیر کے علیحدگی پسند سیاست دانوں نے نوزائیدہ جنگ بندی سے لاتعلقی اختیار کر لی اور اس طرح بھارت سے بات چیت کے امکانات کو مسدود کر دیا۔

جنگ بندی اگست میں تیزی سے تحلیل ہوگئی۔ کشمیری لیڈروں نے بھارت پر الزام لگایا کہ وہ بات چیت کو بھارتی آئین کے دائرہ کار کے اندر محدود رکھنے یا انسانیت کے بڑے عنوان پر اصرار کر کے دراصل مذاکرات سے انحراف کر رہا ہے۔ بھارت اور امریکہ نے حزب المجاہدین کے لیڈر سید صلاح الدین کا حوالہ دیا جن کا جنگ بندی کے متعلق رویہ غیر یقینی تھا۔ جوں ہی جنگ بندی کا اعلان ہوا سید صلاح الدین نے ہر ابلاغی ذریعہ سے کام لیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ جب تک پاکستان کو شریک نہ کیا جائے بھارت سے کسی قسم کی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں سرد مہری کے باوجود ٹریک ٹو کے عنوان سے دونوں جانب کے لوگوں کے درمیان نجی رابطے بڑھتے رہے۔ یوم پاکستان کے موقع پر ۱۴ اگست کو پاکستان نے ایک دفعہ پھر بھارت کو مسئلہ کشمیر پر براہ راست بات چیت کی دعوت دی۔ اس کے پس پردہ امریکہ اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کا دباؤ تھا جنہیں دونوں ممالک کے

درمیان کشیدگی پر تشویش تھی۔

موسم گرما کے اختتام پر امکان تھا کہ حزب المجاہدین ایک اور جنگ بندی کا اعلان کرے گی لیکن ایسا جلد نہ ہوا اور جب ہوا تو یہ اعلان نئی دہلی کی جانب سے تھا۔ بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے ۱۹ نومبر ۲۰۰۰ء کو اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مقدس مہینہ رمضان المبارک کے دوران بھارتی فوج مجاہدین کے خلاف جموں و کشمیر میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کرے گی۔ اس کے ساتھ واجپائی نے اپنے اگست کے بیان کا حوالہ دیا جس کے تحت تمام مسائل کا حل انسانیت کے جذبے کے تحت تلاش کیا جائے گا نیز مجاہدین کے ساتھ بات چیت کے دروازے کھلے ہیں۔

۲۷ نومبر ۲۰۰۰ء کو رمضان المبارک کے آغاز پر بھارتی فوج نے جارحانہ کارروائیاں بند کر دیں جبکہ مجاہدین کی کارروائیاں جاری رہیں اور جموں سے ۱۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سرنجو گاؤں میں چار بچے قتل کر دیے گئے۔ اس حملے کے باوجود پاکستان نے چند دن بعد بھارتی جنگ بندی اعلان کا مثبت جواب دیا۔ پاکستان کے سیکرٹری خارجہ انعام الحق نے اعلان کیا کہ کنٹرول لائن پر متعین پاکستانی فوج زیادہ سے زیادہ ضبط و تحمل سے کام لے گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نجی مذاکرات کے عمل نے بھارت اور پاکستان کے درمیان رسمی مذاکرات کی راہ ہموار کی ہے۔ اس میں کشمیری راہنما شامل ہوں یا نہ ہوں، لیکن وقت ہی یہ بتائے گا کہ کیا موجودہ کوششیں پائیدار امن کے لیے رنگ لاتی ہیں یا سابقہ کوششوں کی طرح بے ثمر ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ امریکہ پس منظر میں رہ کر اپنا فعال کردار جاری رکھتے ہوئے بھارت اور پاکستان کے درمیان سنجیدہ بات چیت اور مسئلہ کشمیر کے پائیدار حل کے لیے اقدامات چاہتا ہے۔ صدر بش کو ایک بالکل سیدھی سادی کشمیر پالیسی ورثے میں ملی ہے یعنی خود کو پس منظر میں رکھو، حل کی حوصلہ افزائی کرو لیکن مداخلت سے گریز کرو۔

اسلام آباد کا محلاتی مناقشہ

کئی علیحدگی پسند کشمیری راہنما ۱۹۹۹ء کے کارگل بحران پر ناراض تھے۔ اس پہاڑی جنگ سے دنیا کی توجہ مسئلہ کشمیر سے ہٹ گئی اور بھارت کے اس پروپیگنڈہ کو تقویت ملی کہ کشمیر کی تحریک آزادی داخلی نہیں

بلکہ پاکستان کی مداخلت کا نتیجہ ہے۔ کارگل جنگ کے اثرات پورے خطے میں محسوس کیے گئے۔ بھارتی شہریوں کے نزدیک کشمیر ایک دور دراز مسئلہ ہے جو یہاں کی تہذیب میں رچ بس چکا ہے۔ تازہ بھارتی فلم ''مشن کشمیر'' سے بھی یہ بات عیاں ہے۔

کارگل بحران سے پاکستان میں خارجہ امور اور سلامتی سے متعلق اعلیٰ حلقوں میں ۱۹۹۸ء سے جاری ایک بحث زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ کئی برس پہلے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کے علاوہ کوئی بات کہنا بہت مشکل تھا جبکہ آج پاکستان میں اعتدال پسندوں کا ایسا گروہ قوت پکڑ رہا ہے جو ۱۹۴۷ء کی کشمیر پالیسی میں تبدیلی کے لیے دلائل دیتا ہے۔

اعتدال پسندوں کے نزدیک تقسیم ہند کے نامکمل ایجنڈے کو مکمل کرنے کی دلیل ۵۴ برس گزر جانے کے بعد عالمی سطح پر اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ نصف صدی پہلے کی اقوام متحدہ کی قراردادیں پاکستان میں مقیم مغربی سفارت کاروں کی نگاہ میں رسوائی اور کشمیر پر کام کرنے والے علمی اور صحافتی حلقوں کے لیے دکھ کا باعث ہیں۔ اس کے بجائے اعتدال پسند، پاکستان کی طرف سے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی بامعنی حمایت چاہتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کی عملی تعبیر یہ ہے کہ [پاکستان یا بھارت سے] الحاق کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کو استصواب کے وقت آزادی اور خودمختاری کا حق انتخاب (تھرڈ آپشن) بھی حاصل ہونا چاہیے۔ بہرحال بھارت اب بھی کشمیر کے مسئلے میں بین الاقوامی مداخلت پر تقریباً اتنا ہی محتاط ہے جتنا کہ وہ رائے شماری کے مطالبے کا مخالف ہے۔ کیونکہ اسے یقین نہیں ہے کہ کشمیر کے ''گمراہ نوجوان'' بھارت کے ساتھ الحاق کو ترجیح دیں گے۔ اس صورت میں پاکستان کے اعتدال پسندوں کے نزدیک بہترین راستہ یہی ہے کہ فیصلہ کشمیر کے عوام پر چھوڑ دیا جائے۔

چند پاکستانی اعتدال پسند کشمیر کے ساتھ پاکستان کی موجودہ وابستگی کو پسند نہیں کرتے اور وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی قسمت کا تعین خارجہ پالیسی کی کامیابی سے نہیں بلکہ اقتصادی کامیابی سے ہوگا۔ پاکستان کی قسمت آج بیرونی سرمایہ کاروں، آئی ایم ایف اور برسراقتدار جرنیلوں سے وابستہ ہے۔ لہٰذا آج پاکستان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت ان لوگوں کی ہے جو پاکستان کی معیشت کو بحال کر سکتے ہیں۔ انہیں مسئلہ کشمیر سے سروکار نہیں جو پاکستان کے ناقابل برداشت بھاری فوجی بجٹ کا ایک جواز ہے۔

اس کے برعکس روایت پسند لوگ ۵۴ سالہ تاریخی موقف میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں پاکستان کے بنیادی موقف میں کوئی تبدیلی کشمیر کے مسئلے کی بین الاقوامی اہمیت کو ختم کرنے کی راہ ہموار کرے گی، جس کے نتیجے میں بھارت کو کشمیر ہڑپ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ بلاشبہ کشمیر کے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں میں ترمیم اقوام متحدہ ہی کر سکتی ہے لیکن جو بھی ہو روایت پسندوں کی دلیل میں وزن ضرور ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ پاکستان اگر اپنا موقف تبدیل بھی کر لے تو بھی بھارت کی طرف سے اس کا مثبت جواب نہیں ملے گا۔ چونکہ امریکہ کی اقتصادی امداد پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور اسی بناء پر آئی ایم ایف بھی پاکستان کو دیوالیہ ہونے نہیں دے گا اس لیے اُن کے نزدیک اسلام آباد کو اپنے موقف پر ڈٹے رہنا چاہیے۔ وہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ مستقل الحاق چاہتے ہیں۔

بعض اعتدال پسند بھارت سے برسرپیکار کشمیری جنگجوؤں کی امداد بند کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں محض جنگی کارروائیاں بھارت کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں لیکن ایک ایسی مضبوط تحریک جس کی جڑیں کشمیری عوام میں ہوں وہ بین الاقوامی برادری سے ازسرِنو حمایت حاصل کر سکتی ہے۔ [ان کے برعکس] روایت پسند کشمیری خفیہ امداد میں کسی بھی کمی کے خلاف ہیں۔ ان کی یہ بات بھی بے جا نہیں کہ مجاہدین کی خفیہ امداد میں کمی بھارت کو غیر منصفانہ فائدہ پہنچائے گی۔ امریکہ میں پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی کے حالیہ بیانات سے بھی پاکستان کے اعتدال پسند حلقوں کے نقطہ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ آزاد اور خودمختار کشمیر کے قیام کے امکان پر بھی غور کرنے کے حق میں ہیں اور بظاہر وزیر خارجہ بھی کشمیر میں مجاہدین کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے تیار ہیں۔

نومبر ۲۰۰۰ء میں کم از کم ایک ریٹائرڈ پاکستانی اعلیٰ افسر جنہیں حکومت پاکستان کا تعاون حاصل تھا، لندن اور واشنگٹن کے پالیسی ساز حلقوں میں اعتدال پسندوں کا نقطہ نظر پیش کرتے رہے۔ اگرچہ یہ اقدام ردِعمل معلوم کرنے کا بہانہ تھا تاہم اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ پاکستان جو اپنی افغان پالیسی کی وجہ سے تنہائی کا شکار ہے اور اسے دوستوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے وہ کشمیر کے مسئلے پر ازسرِنو غور کرنے پر آمادہ ہے۔

بھارتی افسران ذاتی طور پر تازہ رجحانات سے بہت خوش ہیں۔ ان کے خیال میں ایک کمزور

پاکستان کو موجودہ نام نہاد کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح بھارت کے زیر قبضہ کشمیر پر بھارت کا اور پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر پر پاکستان کا کنٹرول برقرار رہے گا۔ اس طرح بھارت بین الاقوامی سطح پر کشمیر پر اپنی حاکمیت تسلیم کرالے گا اور انہیں یقین ہے کہ کشمیر کے باقی ماندہ مسائل سے وہ وقت آنے پر خود ہی نمٹ لیں گے۔ کشمیر پر حاکمیت تسلیم کرانے کے سلسلے میں اگرچہ بھارت آج پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہے لیکن اس سے زیادہ مشکل وہ آخری اقدامات ہیں جو اس ثمر کو پانے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وہ ایسا کر بھی لے تو یہ امر غیر حقیقی ہوگا کیونکہ حاکمیت، عالمی حمایت سے الگ اور بڑی چیز ہے۔ کشمیریوں کی نمایاں اکثریت کو بھارتی شہریت کو دل سے تسلیم کرنا ہوگا۔

پاکستان نے بظاہر تمام امکانات کو کھلا رکھا ہے۔ اعتدال پسندوں کو اپنے خیالات کے اظہار کی کھلی آزادی ہے لیکن سرکاری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وزیر خارجہ عبدالستار نے اکتوبر ۲۰۰۰ء میں پھر کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کا مطالبہ دہرایا ہے۔ بہت سے پاکستانی سمجھتے ہیں کہ یہ تکرار کافی نہیں۔ بھارت ایک ہٹ دھرم قوت ہے۔ پاکستان کو بہرحال پائیدار امن کی پیشکش کرنی ہوگی۔

نئی دہلی کی خود اعتمادی

صدر کلنٹن نے مارچ ۲۰۰۰ء میں بھارت کا دورہ کیا۔ جواباً واجپائی نے ستمبر میں امریکہ کا دورہ کیا۔ اس کے نتیجے میں دونوں ممالک میں اجنبیت دور ہوگئی اور ہم آہنگی اور قربت پیدا ہوئی۔ یہ گرم جوشی انسداد دہشت گردی سے تجارت کے فروغ تک بہت سے مسائل پر تعاون کا ذریعہ بنی۔ تاہم بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی سطح پر امریکی تشویش برقرار رہی۔ ۱۹۹۹ء کے کارگل واقعہ سے ثابت ہوا کہ پاکستان بھارت کے مقابلے میں امن کے لیے زیادہ خطرناک ہوسکتا ہے۔

پاکستان ۱۹۹۸ء سے کشمیر کے کنارے پر بیٹھا انتہائی خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ کارگل کے واقعہ سے کشمیر میں اسلام آباد کی فوجی مداخلت ظاہر ہوگئی اور اس پر عالمی اعتماد سخت مجروح ہوا۔ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے دوران پاکستان کی پشت پناہی سے کشمیر میں جنگی کارروائیوں نے زور پکڑا، اگرچہ بعض اس کا ذمہ دار

بھارت کو ٹھہراتے ہیں۔ خاص کر جولائی ۲۰۰۰ء سے بھارت نے دراندازوں کا پیچھا کرنے کے نام پر کنٹرول لائن کی لگاتار خلاف ورزیاں کیں۔ پاکستان پر بھی کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کا الزام ہے جسے وہ تسلیم نہیں کرتا اور کشمیری جنگجوؤں کی کارروائی قرار دیتا ہے۔ پاکستان کی کشمیری مجاہدین کے لیے پوشیدہ حمایت ۱۹۸۰ء سے جاری ہے لیکن پاکستان کو کشمیر میں تحریک آزادی تیز کرنے کی سزا دینے کی تجویز ایک الگ مسئلہ ہے۔ ۱۹۹۰ء کے شروع میں بھارتی وزارت خارجہ کے سخت گیر افسروں اور حکومت کے سلامتی کے اعلیٰ مشیروں کے درمیان اس پر کھلی بحث جاری تھی تاہم واجپائی نے بات چیت کے راستے کو ترجیح دی جو کارگل کی لڑائی پر آ کر ختم ہوئی۔ کشمیری امریکن فاروق کٹھواری اور فاروق اعجاز کشمیر کے مسئلے پر جوئر یک ٹو سفارت کاری کرتے رہے اس پر یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے پس پردہ امریکی حوصلہ افزائی تھی جو علاقائی کشیدگی میں کمی کا خواہش مند ہے۔

بیرونی دنیا میں بھارت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس کے اقتصادی امکانات کی وسعت ہے۔ دو برس قبل تجزیہ نگاروں نے مغربی دنیا اور بھارت کے درمیان قریبی تعلقات کی امید ظاہر کی تھی۔ عالمی اقتصادی منڈی میں بھارت کی شمولیت نے اسے بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے ترغیب و تحریص کا باعث بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں سرمایہ کار جاتے ہیں وہاں کی حکومتوں کا جھکاؤ بھی اسی طرف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی ایٹمی صلاحیت پر اعتراضات بھی بتدریج اوجھل ہو گئے ہیں۔

اگرچہ بھارت کے لیے سفارتی فضا بہتر ہو رہی ہے لیکن اسے کشمیر پر قبضے کے جواز کے بارے میں شدید اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کشمیر کے بعض حصے گڑبڑ سے محفوظ ہیں خصوصاً بدھ اور شیعہ مسلمانوں کا علاقہ لداخ - ہندو علاقہ جموں خاموش ہے جبکہ وادی کشمیر اور کنٹرول لائن سے متصل علاقے بری طرح متاثر ہیں۔ بھارت کی موثر سفارت کاری اور اسے حاصل شدہ سیاسی حمایت خود کشمیر میں انتظامی بحران اور داخلی امن و امان کی صورت حال کو بہتر نہیں کر سکتی۔

کشمیر میں مشکل صورت حال اور امریکہ کی گرم جوشی دونوں سے نئی دہلی کے جارحیت پسند عناصر اسلام آباد کو سبق سکھانے کا حوصلہ پا سکتے ہیں۔ ان میں سے کئی تو پاکستان کا وجود ہی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں اور اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کا بھارتی نظریہ کہ ''کمزور پاکستان، پاکستان نہ ہونے

سے بہتر ہے''۔ اب ''تخریب کار پاکستان سے پاکستان کا خاتمہ بہتر ہے'' میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن یہ جذبات کہاں تک جائیں گے؟ پاکستان مخالف عناصر اور بھارت کے داخلی اتحاد کے داعی بھارت میں ایک وسیع حلقہ تشکیل دیتے ہیں۔ مغربی دنیا کو پاکستان میں قدامت پسندوں کے اعتدال پسندوں پر غلبہ کے پیش نظر سرحد کے دونوں جانب کے رویوں کا محتاط جائزہ لینا چاہیے۔

۲۰۰۰ء کے اختتام پر جا کر امن کی جانب کچھ سرگرمی دکھائی دی ہے۔ کشمیر میں کنٹرول لائن پر کشیدگی میں کمی اس سرگرمی کا ایک واضح اظہار ہے۔ تاہم بہت سے کشمیری امریکہ کی امن کوششوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں امریکی کوششوں سے جو مذاکرات ہوں گے ان کے نتیجے میں ایک ہی فریق نقصان میں رہے گا اور وہ خود کشمیری ہوں گے۔

کشمیریوں کا کیا بنے گا؟

بھارت کو تا حال جموں وکشمیر میں شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ ۱۹۹۶ء سے یہاں ایک منتخب حکومت قائم ہے لیکن اس کی مقبولیت بہت کم ہے اور وہ اقتصادی استحکام اور بھارت سے سیاسی خودمختاری کے وعدوں کے درمیان ڈگمگا رہی ہے۔ کشمیر میں بھارتی وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کا عوام سے واسطہ کم ہی ہے البتہ وہ قومی سیاست میں حصہ لینے کو تیار ہو سکتا ہے اور بھارت کے لیے اچھا صدر ثابت ہو سکتا ہے۔ حریت کانفرنس کے اکثر قائدین، جو جیل میں یا جیل سے باہر رہے ہیں اور محاذ آراء قوتیں ۱۹۹۹ء کے کارگل بحران کے بعد شدت اختیار کر گئی ہیں۔ اب بھارت کو تازہ عسکری چیلنج کا سامنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نئی دہلی کے پاس اس کا فوجی جواب موجود ہو لیکن ایسا کوئی طریقہ نہیں جس سے کام لے کر وہ کشمیریوں کو دوبارہ اپنی رعیت اختیار کرنے پر راضی کر سکے۔

جس طرح بھارت کی کشمیر سے محبت بے فائدہ رہی اسی طرح عسکریت پسندوں کی طاقت کے زور پر بھارت سے نجات پانے کی کوششیں بھی بے سود رہیں۔ مجاہدین ۱۹۹۵ء سے پاکستان اور دیگر ممالک کے رضا کاروں پر انحصار کرتے ہیں اور بہت سے کشمیری اس لڑائی سے عاجز آ چکے ہیں۔ بندوق بندوق ہے، خواہ وہ عسکریت پسندوں کے ہاتھ میں ہو یا فوج کے پاس۔ ممکن ہے عسکریت پسندی خفیہ جنگ

(proxy war) بنتی جارہی ہولیکن یہ جنگ لڑنے والے اوران کے حمایتی امن کی بھارتی تجویز قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

اس وقت کشمیری عوام کے لیے پسند و ناپسند کا امکان محدود ہوسکتا ہے لیکن مسلط کردہ امن امن نہیں کہلا سکتا۔ اس کا مطلب مسئلہ کشمیر من وعن آئندہ نسل کو منتقل کرنا ہے۔ اسرائیل اور فلسطین کی طرح گھڑا گھڑایا اور غیر حقیقی امن فارمولہ مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ بات کشمیر میں پھر نئی تحریک شروع ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

دریں اثناء کشمیر اور بھارت کے درمیان آزمائشی سرگرمیاں کامیاب نہیں ہوئیں۔ کشمیر میں روایت پسند بھی ہیں اور اعتدال پسند بھی۔ روایت پسند اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے پر عمل درآمد کے مطالبے سے سرمو انحراف کے لیے تیار نہیں۔ جبکہ اعتدال پسند سیاسی بدامنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول کے لیے نئے راستے اختیار کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ان میں سے ایک حزب المجاہدین کے عبدالمجید ڈار ہیں۔ حزب المجاہدین کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑنے والا سب سے موثر گروہ ہے کیونکہ اس میں کشمیری جنگجوؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اسے جماعت اسلامی کی حمایت حاصل ہے۔ اسے نہ صرف نئے رضا کاروں کی کھیپ مسلسل پہنچائی جارہی ہے بلکہ وادی کے ہر گاؤں میں یہ اپنے مددگار خاندانوں پر بھروسہ کرسکتی ہے۔

جماعت اسلامی کے کئی رہنما بشمول غلام محمد بٹ نجی اور عوامی سطح پر بارہا حق خودارادیت کے حصول کے موجودہ طریقہ کار کی کامیابی پر اپنے تحفظات اور شبہات کا اظہار کرچکے ہیں۔ ان کے نزدیک عسکریت ایک قوت بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ ۱۹۹۷ء کے اواخر سے جماعت اسلامی کی داخلی سیاست پر اعتدال پسند غالب آچکے ہیں جس سے حزب المجاہدین کے اعتدال پسندوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے ہیں۔ اگر کشمیر کے مسئلے پر بات چیت ہوتو ممکنہ طور پر اس میں یہ سمجھدار اور فہمیدہ راہنما بھی شریک ہوں گے۔

کشمیر کسی بھی طرح اکائی نہیں۔ وادی کشمیر میں ۹۵ فیصد مسلمان اور کشمیری بولنے والے جو کشمیر کا سب سے زیادہ ہم رنگ اور باہم مربوط علاقہ ہے۔ باقی ساری ریاست میں مختلف مذاہب، زبانوں اور نسلوں کی رنگارنگی اور تنوع موجود ہے۔ بہت کم لوگ اقلیتوں کا سنجیدگی سے ذکر کرتے ہیں۔ یہ [راہنما]

بھارت پر کشمیریوں میں نوآبادیاتی طرزِ عمل اختیار کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ابھی تک ہندو اکثریتی علاقوں میں اپنے مکمل دفاتر قائم کر کے ۱۹۹۰ء میں کشمیر چھوڑنے والے قریباً ایک لاکھ چالیس ہزار ہندو پنڈت مہاجرین کے مسائل حل کرنے پر توجہ نہیں دی ہے۔ اگرچہ مسلم اکثریت کے لاکھوں شہری سرکاری ظلم و تشدد کا نشانہ بن تاہم کل جماعتی حریت کانفرنس اگر واشنگٹن کی سنجیدہ توجہ چاہتی ہے تو کشمیر کی کثرتیت (pluralism) کا خیال رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔

مسئلہ کشمیر کو جنوبی ایشیا سے باہر کشمیریوں اور ان کے سیاسی عزائم کے حوالے سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ اسے امریکہ اور برطانیہ کی خارجی پالیسی کا کوئی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر کا اصل مسئلہ تو احساس ذمہ داری اور فرض منصبی سے تعلق رکھتا ہے لیکن آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کچھ مفاد بھی وابستہ ہے۔ بلاشبہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی میں کمی پورے جنوبی ایشیا کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ لیکن اس کا کشمیری عوام پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ فسادات اور ہنگامہ آرائی کے خاتمے کا بہرحال خیر مقدم کیا جائے گا۔

منفی نقطہ نظر سے یہ رویہ کشمیری عوام کے مسائل سے لاتعلقی کا مظہر ہے۔ متاثرہ مسلمان ہوں یا بے گھر کشمیری پنڈت، جو جلاوطنی میں اپنی برادری قائم رکھے ہوئے ہیں، کشمیر کا جغرافیہ اور اس کی علامتی حیثیت ان کے نزدیک زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ دوسری جانب یہ نئی علاقائیت سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے کنٹرول لائن کے دونوں جانب کے کشمیریوں کے مسائل کے حل کی جانب اصولی طور پر زیادہ عالمی توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے اور قومی اور بین الاقوامی امدادی ایجنسیوں کی جانب سے امداد کا راستہ کھل سکتا ہے۔

مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے جو تجاویز بھی دی گئی ہیں ان میں کنٹرول لائن کو معمولی ردوبدل کے بعد مستقل سرحد قرار دینے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ وکٹوریہ شوفیلڈ نے تجویز کیا کہ پابندیوں میں نرمی کر کے کنٹرول لائن کے دونوں جانب کے کشمیریوں کو آزادانہ میل جول کا موقع فراہم کیا جائے، اس سے دونوں جانب اعتماد پیدا ہوگا۔ بھارت کو یہ پسند ہوگا، امریکہ بھی اعتراض نہیں کرے گا لیکن پاکستان شائد اسے تسلیم نہ کرے۔ جہاں تک کشمیریوں کا تعلق ہے، ان سے کسی نے نہیں پوچھا۔ کسی ترغیب کے بغیر کشمیری نوجوان اس تجویز کو کیوں قبول کریں گے۔ سمجھوتے کے لیے کسی کو آگے آنا ہوگا۔ جب تک پاکستان راضی

نہ ہو عسکریت جاری رہے گی۔ ممکن ہے بہت سے کشمیری چپ سادھ لیں لیکن ان کے دل ایسے کسی سمجھوتے کا ساتھ نہیں دیں گے۔ ''کنٹرول لائن حل'' تسلیم کرنا ممکن ہے وادی کے کشمیریوں کے لیے ایک بہت بڑا سمجھوتہ (compromise) کرنے کے مترادف ہو، تاہم امریکہ کو اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرتے ہوئے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

کشمیر کے دو مسائل

امن قائم ہو یا نہ ہو کشمیر پھر بھی امریکی ایجنڈے کا حصہ بنا رہے گا۔ اگر بش انتظامیہ مسئلے کا حل ضروری سمجھتی ہے اور اس تنازع کو علاقائی سلامتی کے لیے خطرناک قرار دیتی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ یہ مسئلہ کشمیریوں کی موثر شرکت اور حمایت کے بغیر حل نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ مسئلے کے حل کی کوئی تجویز خود کشمیریوں کی طرف سے پیش کی جائے جس کی امریکہ سمیت باقی ممالک حمایت کریں۔ ایک ''جنوبی ایشیائی'' حل بھارت کے لیے سازگار ہوگا۔ لیکن مسئلے کا کوئی حل اس وقت تک موثر نہیں ہوگا جب تک اسے وادی کے کشمیریوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو جہاں سب سے زیادہ بدامنی ہے۔ یہ حل پاکستان کے مطالبے سے بہت کم ہے لیکن موجودہ حالات کا جو ادراک پاکستان اور بھارت کے اعتدال پسند رکھتے ہیں، یہ حل اس کا احاطہ کرتا ہے۔ بات تو یہ ہے کہ سٹیٹس کو برقرار رکھتے ہوئے حل نکالنا کافی نہیں ہے چنانچہ [ایسے حل کے بعد بھی] بھارت کو اس عظیم مسئلے کا سامنا رہے گا۔ واجپائی ایک انقلابی لیڈر کیسے ہو سکتا ہے جب ایل کے ایڈوانی جیسے امکانی حریف اس کی پَروں میں چھپے بیٹھے ہوں؟

درحقیقت کشمیر کے دو بڑے مسائل ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں اور مختلف بھی اور دونوں بڑے حقیقی اور دوررس ہیں۔ اگر انہیں علیحدہ علیحدہ رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی گئی تو دونوں لاینحل رہیں گے، لیکن اگر دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہوئے حل کیا گیا تو بھی نقصان کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جموں و کشمیر کی ریاست کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کیا یہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کو دے دی جائے؟ یا اسے آزاد کر دیا جائے؟ یا تقسیم کر دیا جائے؟ کشمیر کے اس مسئلہ نے ۱۹۴۷ء سے قانونی اور سفارتی ماہرین اور قلم کاروں کو مصروف کر رکھا ہے۔ گزشتہ

۵۴ برس سے یہ مسئلہ ایک خیالی مناظرے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان اس پر حال کو فراموش کر کے ماضی کے حوالے سے بحث کرتا ہے اور بھارت ماضی سے کٹ کر اسے حال (۱۹۷۱ء کے بعد کے تناظر) میں زیر بحث لاتا ہے۔ باہر والوں کے لیے یہ مسئلہ محض جغرافیے اور جغرو سیاست کے ایک مسئلے تک محدود ہو گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو بہت پیچیدہ اور اثر انگیز ہے وہ خود کشمیری عوام کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت کس طرح حاصل کریں؟ ۱۹۸۸ء سے جاری عسکری جدوجہد میں اب تک ۳۵ ہزار سے زیادہ کشمیری کام آ چکے ہیں۔ لیکن یہی مسئلہ کے پائیدار حل کا واحد ذریعہ ہو سکتا ہے۔

[الیگزینڈر ایوانز کنگز کالج لندن کے سنٹر فار ڈیفنس اسٹڈیز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں، وہ کشمیر پر بی بی سی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے باقاعدہ تجزیہ نگار ہیں۔]